# فکر اسلامی کی تشکیلِ جدید کا مسئلہ

حکیم الاسلام حافظ قاری حضرت مولانا محمد طیب مدظلہٗ

قسط

(۲)

گذشتہ سے پیوستہ

اس لئے فکرِ اسلامی کی تشکیلِ جدید کے سلسلے میں پہلا قدم جو ہمیں اٹھانا چاہئے وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے فکر کے لئے سب سے پہلا فکر ایک نشانہ اور ہدف متعین کر لینا چاہئے جس پر ہم اپنے فکر کی توانائی صرف کریں۔ اور شاخ در شاخ مسائل اس نقطے سے جوڑتے چلے جائیں جس سے نہ صرف راستہ ہی سامنے آجائیگا بلکہ تشتّت افزا اوہام وخیالات بھی خود بخود اس سے دفع ہوتے چلے جائیں گے اور ہمارا قدم بجائے منفی ہونے کے مثبت انداز سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ سو ہمارے نزدیک وہ جامع نقطہ ایک ہی ہے جس کا نام منہاج نبوۃ ہے جس پر فکر کو مرکوز کر دینے کی ضرورت ہے، کیونکہ اس منہاج ہی کی شمع ہاتھ میں لے کر یہ قوم آگے بڑھی ہے۔ اور ظلمتوں میں اجالا پھیلتا چلا گیا ہے۔ پس اس منہاج سے آج بھی آگے بڑھ سکتی ہے۔ اس منہاج نبوۃ کو سامنے رکھ کر ہمارے سامنے وہ مزاج آجائے گا جو اس امت میں نبی امت نے پیدا فرمایا ہے۔ اور یہ واضح ہو جائے گا کہ خود اسلام کی تشکیل کا آغاز کس نوعیت سے ہوا کہ ہم اس کے فکرِ جدید کا آغاز بھی اس نوعیت سے کریں نیز یہ بھی سامنے آجائے گا کہ اس نے ابتدائی مراحل سے گزر کر اور آخر کار اپنی انتہائی منزل پر پہنچکر بحیثیت مجموعی اس امت کا مزاج کیسا بنایا۔؟ اور اسے کس ذوق پر ڈھالا، غور کیا جائے تو اس منہاج نبوۃ نے اصولی طور پر ہمیں دین کے بارے میں کمالِ اعتدال اور توسط کا راستہ دکھایا ہے۔ نہ تو اس نے ہمیں رہبانیت کے راستے پر ڈالا کہ ہم عبادت اور دین داری کے نام پر دنیا کو کلیتہً ترک کر کے زاویہ نشین ہو جائیں۔ شہری آبادیوں، تمدّنی معاملات اور مدنیت کے سارے تقاضوں بلکہ خود اپنے سارے طبعی جذبات ومیلانات کو بھی چھوڑ کر پہاڑوں اور غاروں میں جا بیٹھیں کہ نہ گھر ہو نہ در، نہ معاشرہ ہو نہ معیشت، نہ انسانی روابط ہوں، نہ قومی تعلقات، نہ موانست باہمی ہو، نہ اجتماعیت،

کہ نہ یہ اسلام کا مزاج ہے نہ اس کا مطالبہ اور نہ ہی فطرۃ کا تقاضا۔ اس لئے اسلام نے اس کا نام رہبانیت رکھ کر اس کی بر ملا نفی کی ہے۔ کہ :

لا رھبانیۃ فی الاسلام ۔ اسلام میں رہبانیت کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور نہ ہی ہمیں بہیمیت کے راستے پر ڈالا ہے۔ کہ ہم مدنیت کے نام پر عبادت الٰہی اور طاعت نبوی سے بیگانہ ہو کر کلیۃ نظام دنیا سنوارنے، جاہ و مال کے خزانے بٹورنے میں لگ جائیں اور راحت طلبی اور عیش کوشی میں غرق ہو جائیں اور ہماری زندگی کا نصب العین ہی ہوس رانی، حظ اندوزی اور ہوائے نفس کی غلامی کے سوا دوسرا نہ ہو۔ نہ عقائد رہیں نہ عبادات، نہ فرائض رہیں نہ سنن، نہ واجبات ہوں نہ ان کی لگن، نہ قومی تربیت کا داعیہ رہے۔ نہ صلہ رحمی اور خیر جوئی اور نہ اولاد و اقارب کا جذبہ، بلکہ رات دن ہوائے نفس کی پیروی، شبانہ روز لہو و لعب عیش و طرب، آرائش و آسائش اور نمائش و زیبائش مالی تکاثر اور جاہی تفاخر ہی زندگی کا مشغلہ بن کر رہ جائے سو اسے بھی اسلام نے نمائشی زندگی، متاع اور غفلت یا بالفاظ مختصر بہیمیت کہہ کر اسے امت کے قومی مزاج سے خارج کر دیا ہے۔ فرمایا :

| | |
|---|---|
| وما الحیٰوۃ الدنیا الا متاع | اور دنیاوی زندگی تو کچھ بھی نہیں صرف دھوکے کا سودا |
| الغرور یعلمون ظاھرا من | ہے۔ یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے |
| الحیٰوۃ الدنیا وھم عن الاٰخرۃ | ہیں اور یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں۔ |
| ھم غافلون ۝ | ... |
| ذرھم یاکلوا ویتمتعوا | اور آپ ان کو (ان کے حال پر) رہنے دیجئے کہ وہ |
| ویلھھم الامل فسوف | کھالیں اور چین اڑالیں اور خیالی منصوبے ان کو |
| یعلمون ۔ | غفلت میں ڈالے رکھیں ان کو ابھی حقیقت معلوم |
| ... | ہوئی جاتی ہے۔ |

بلکہ اس افراط و تفریط سے الگ کر کے دنیا کو ترک کرنے کی بجائے اس کی لگن کو ترک کرایا ہے اور دین کو اصل رکھنے کے ساتھ اس میں غلو اور مبالغے سے روکا ہے یعنی ایک ایسا جامع فکر دیا ہے جس میں دنیا کے شعبوں کو زیر استعمال رکھ کر ان ہی میں سے آخرت پیدا کی ہے۔ چنانچہ دنیا کو کھیتی بتلایا اور آخرت کو اس کا پھل۔

الدنیا مزرعۃ الاٰخرۃ ۔ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ اگر پھل ضروری ہے تو کھیتی بھی اتنی ہی ضروری ہے۔ اس لئے اسلام کے ہر حکم میں جہاں اجر آخرت ہے وہیں حظ دنیا بھی شامل ہے۔ مثلاً اگر مسواک میں ثواب آخرت ہے تو وہیں منہ کی خوشبو بھی

پیش نظر ہے۔ اگر طیبات رزق میں بہ نیت حسن عبادت کی قوت رکھی گئی ہے وہیں کام و دہن کے ذائقے سے بھی اجتناب نہیں بتلایا گیا ہے۔ اگر لباس میں بہ نیت آخرت اور غیرت حیا اور ستر عورت کا تحفظ اصل ہے تو وہیں حسن دنیوی اور وقار بھی ملحوظ ہے، اگر ازار کو ٹخنوں سے نیچا اور زمین سے گھسٹتا ہوا رکھنے کی ممانعت سے کبر و نخوت اور جاہ پسندی کے تخیل سے بچایا ہے تو وہیں لباس کو آلودگی اور گندگی سے پاک اور صاف رکھنے کی صورت بھی اختیار کی گئی ہے، جو دنیاوی مفاد ہے۔ اگر تخت شاہی کا اصل مقصد عدل کے ساتھ تحفظ ملک، خدمت خلق اور قومی تربیت بجوابدہی آخرت اصل ہے تو وہیں اسے دنیوی وقار و عزت اور سیادت و قیادت کے حظوظ سے بھی بھرپور کیا گیا ہے۔ بہر حال آخرت کی سچی طلب کے ساتھ دنیا کا کسب و اکتساب بھی لازمی رکھا گیا ہے — صائب نے اس ذوق کو کس خوبی سے ادا کرتے ہوئے کہا ہے ؎

فکر دنیا کن و اندیشۂ عقبیٰ مگذار  تا لعقبیٰ نہ رسی دامن دنیا مگذار

غرض منہاج نبوت نے رہبانیت اور بہیمیت کے درمیان معتدل مزاج پر اس امت کو ڈھالا ہے جس میں طبعی جذبات بھی پامال نہ ہوں بلکہ ٹھکانے لگ جائیں اور عقلی مقاصد کی تکمیل میں بھی فرق نہ پڑے اور وہ بروئے کار آجائیں اس لئے اس منہاج کے عناصر ترکیبی تہذیب نفس، تدبیر منزل، سیاست مدن، تسخیر اقالیم، تعظیم امر اللہ، شفقت علی خلق اللہ، نظام اجتماعیت، جماعتی تنظیم و مرکزیت اخلاق و ایثار کی منظم تربیت، نظام امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور اس کے ساتھ فکر آخرت اور محاسبہ اخروی کا استحضار قرار پائے اور پوری قوم کو اسی رنگ میں رنگا گیا ہے۔ تاکہ یہ قوم جامع دین و دنیا بن کر بجائے اس کے کہ دنیا کی اقوام کی حامد، مقلد اور مقتدی بنے اسے خود دار بنا کر امام اقوام اور داعی حق و صداقت کی حیثیت دی گئی ہے ؎

جس طرح احمد مختار ہیں نبیوں میں امام  اُن کی امت بھی ہے دنیا میں امام اقوام

پس آج جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اس منہاج نبوت کو سمجھ کر فکر اسلامی کو ایک نئی ترتیب اور نئے رنگ استدلال سے آج کی زبان اور اسلوب بیان سے مرتب کیا جائے کہ حقیقی معنی میں اسلامی فکر کی یہی تشکیل جدید ہوگی، ورنہ اس منہاج اور اس کے متوارث ذوق سے ذرا بھی ہٹ کر تشکیل ہوگئی تو وہ تشکیل نہ ہوگی بلکہ تبدیل ہو جائے گی جو قلب موضوع ہوگا، اس لئے تشکیل جدید کا خلاصہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ مسائل ہمارے قدیم ہوں اور دلائل جدید، تاکہ یہ نئی تشکیل قائم کر کے ہم خلافت الٰہی اور نیابت نبوی کا حق ادا کر سکیں۔ فکر اسلامی کی تشکیل جدید کا یہ پہلا قدم ہے یا مرکزی نقطہ ہے جس سے ہمیں کام کا آغاز کرنا ہے اور اسی نقطہ پر اپنی تمام توانائیاں صرف کرنی ہیں۔ اس تشکیل جدید کے سلسلے میں دوسرا قدم وہ اصول اور قواعد کلیہ اور ضوابط ہیں جن کے نیچے منہاج نبوۃ کے تمام عقائد و احکام و اخلاق و عبادات اور معاملات و اجتماعیات وغیرہ آتے ہیں تاکہ ہماری تشکیل جدید کا سرچشمہ وہی اصول

ہوں جن سے مسائل کی تشکیل قدیم عمل میں آئی تھی اور اس طرح قدیم و جدید تشکیل میں کوئی تفاوت یا بُعد اور بیگانگی رونما نہ ہوگی ورنہ ظاہر ہے کہ اصول کلیّہ سے ہٹ کر یا انہیں بدل کر یہ تشکیل اسلامی فکر کی تشکیل نہ بن سکے گی۔ اگر ایک شخص سائنس کے فکر کو مرتب یا حل کرنے کے لئے فنِ طب کے اصول سے کام لینے لگے جن کا سائنس کے اصول مسلّمہ اور علوم متعارفہ سے کوئی تعلق نہ ہو، یا منطق و فلسفہ کی فکر کی تشکیل کے لئے صرف و نحو کے اصول سے کام لینے لگے تو وہ کبھی اس تشکیل میں کامیاب نہ ہو سکے گا، اس لئے سب سے پہلے اسلامی فکر کی تدوین و ترتیب میں اسلامی فکر کے اساسی اصول ہی کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ تاکہ ہماری تشکیل سے وہ ذوق فوت نہ ہونے پائے جو ان اساسی اصول میں پیوست کیا گیا ہے اور انہی سے شریعت کے قواعد و مقاصد تک پہنچا ہوا ہے، یہ اصول و قواعد ہی درحقیقت منہاج نبوۃ کو اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہیں جس کا اثر پورے قانون شریعت میں پھیلا ہوا ہے۔ اگر تشکیلِ جدید میں یہ قواعد و ضوابط نہ رہیں تو وہ اسلامی فکر کی تشکیل نہ ہوگی صرف دماغی فکر کی تشکیل بن جائے گی، البتہ ان قواعد کلیہ میں جو ضوابط عبادات اور عقائد کے بارے میں ہیں ان کی عملی جزئیات بھی شریعت نے خود معیّن کر دی ہیں اس لئے ان میں تغیر و تبدل یا کسی جدید تشکیل کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ معاملاتی معاشرتی اور سیاسی و اجتماعی امور میں چونکہ زمانے کے تغیرات سے نقشے ادلتے بدلتے ہیں اس لئے شریعت نے ان کے بارے میں کلیات زیادہ بیان کی ہیں اور ان کی جزئیات کی تشخیص کو وقت کے تقاضوں پر چھوڑ دیا ہے جن میں اصول و قواعد کے تحت توسعات ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے، البتہ ایسے تغیرات کو چونکہ قواعد کلیہ کے تحت رکھا گیا ہے اس لئے ان میں بہرحال فنی استخراج کی ضرورت پڑے گی جسے متبحر علماء کی بصیرت ہی حل کر سکے گی، جیسا کہ قرون ماضیہ میں کرتی رہی ہے۔ بس ایک مجتہد کو اجتہاد کی تو اجازت ہے ایجاد کی نہیں ہے کہ وہ اتباع کے دائرے سے باہر نکل سکے۔ خواہ یہ اتباع جزئیات کا ہو جبکہ وہ منصوص ہوں یا قواعد کلیہ کا ہو جب کہ اجتہادی ہوں جزئیات میں درحقیقت اتباع ان اصول اجتہاد ہی کا ہونا ہے جس کے ذریعے یہ جزئیات باہر آتی ہیں، اس لئے اس تشکیل جدید کے موقع پر یہ کلیات و جزئیات سامنے رکھنی ناگزیر ہوں گی اور انہی کے دائرے میں رہ کر یہ جدید تشکیل و ترتیب عمل میں آسکے گی، نیز اگر اس تشکیل کا مقصد قومی تربیت ہے کہ افراد اس منہاج پر ڈھالے جائیں تو یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ تربیت اصول اور کلیات سے نہیں ہو سکتی جیسے علاج اصول طب اور معرفت خواص ادویہ سے نہیں ہو سکتا جب تک کہ مزاج کے جزوی احوال کو پہچان کر جزوی طور پر نسخہ نہ تجویز کیا جائے۔ یہی صورت شرعیات کی بھی ہے کہ اگر قومی معالجہ اور قومی اصلاح پیش نظر ہو تو وہ محض اصول کلیّہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ جزئیات عمل ہی سے ممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن اصول کا عمل سے کوئی تعلق نہ ہو وہ محض ذہن کی زینت ہوں، عملی زندگی سے انہیں کوئی تعلق نہ ہو، اور کوئی عملی پروگرام بھی ان کے پیچھے نہ ہو تو شریعت نے یہ پسند نہیں کیا کہ ان

میں زیادہ غور و خوض کیا جائے، مثلاً چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا تو قرآن نے اسلوبِ حکیم پہ جواب دیا کہ اس کے منافع سے فائدہ اٹھاؤ ان کے حقائق کے پیچھے مت پڑو۔

یسئلونک عن الاھلۃ قل ھی مواقیت للناس والحج۔ ...

آپ سے چاندوں کے حالات کی تحقیقات کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ وہ آلۂ شناخت اوقات ہیں لوگوں کے لئے اور حج کے لئے۔

روح کے بارے میں سوال کیا تو فرما دیا گیا کہ تمہارا علم اتنا نہیں ہے کہ ان حقائق کو پہچان سکو تو کیوں اس ناقابلِ تحمل بات کے پیچھے پڑتے ہو۔ یہ حقائق یا خود ہی عملی ریاضت سے منکشف ہو جائیں گی یا اگر نہ ہوں تو قیامت میں تم سے ان کا کوئی سوال نہ ہوگا کہ نجات ان پر موقوف نہیں تھی۔

قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یا اس طرح قیامت کے وقت کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرما دیا گیا کہ تمہیں اس سے کیا تعلق تمہاری ترقی اور سعادت اس کے مقررہ وقت کے علم پر موقوف نہیں صرف اس کے آنے کے یقین اور عقیدے پر موقوف ہے۔

اور اس میں یہ جزوی تفصیلات شامل نہیں۔ یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسٰهَا۔ فِیْمَ اَنْتَ مِنْ ذِکْرٰهَا اِلٰی رَبِّکَ مُنْتَهٰهَا۔

یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا سو اس کے بیان کرنے سے آپ کا کیا تعلق اس (کے علم تعیین) کا مدار صرف آپ کے رب کی طرف ہے۔

بہر حال قرآنی رہنمائی سے علم وہی مطلوب اور قابلِ تحصیل ہے جس سے عملی زندگی میں کوئی سدھار پیدا ہوتا ہو اور سعادۃ دارین حاصل ہوتی ہو حاصل یہ ہے کہ عملی زندگی محض اصول سے نہیں بنتی بلکہ جزئیات عمل ہی سے بنتی ہے جس کی بروقت تمرین اور ٹریننگ دی جائے اسی لئے کسی مربی نفس یعنی ربانی کی تفسیر ابن عباس نے الذی یربی الناس بصغار العلم ثم بکبارھا۔ سے کی ہے، یعنی ربانی وہ ہے جو ابتداً چھوٹی چھوٹی جزئیات سے لوگوں کی تربیت کرے اس لئے قرآن حکیم نے تذکیر و مواعظ اور امر بالمعروف کے نظام کو اجتماعی طور پر مستحکم کیا اور اسے تمکین فی الارض (حکومت و سلطنت کی) بنیادی غرض و غایت ٹھہرایا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس منہاج پر ہم اپنی فکر کی توانائی صرف کریں وہ جہاں اصولی ہو وہیں وہ جزئیات عمل سے بھی بھرپور ہو تاکہ علم اور عمل دونوں جمع ہو سکیں کہ اس کے بغیر ہمارا فکر اور اس کی تشکیل پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔

حاصل یہی ہوا کہ فکرِ اسلامی کی ترتیب کے وقت جیسے اسلامی بنیادوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ایسے ہی

فقہ اور فقہی جزئیات کا سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔ البتہ مناسب اور آج کے دور کی نفسیات کو سامنے رکھ کر ان جزئیات میں ترجیح و انتخاب جدا بات ہے وہ اہل علم کا کام ہے، مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اصول کا تعارف اور ان کی جامعیت و وسعت نیز ان کے اندرونی مضمرات کی وضاحت ان کی جزئیات کے بغیر ممکن نہیں، نظری اصول کتنے بھی معقول اور دلپذیر ہوں لیکن جب تک ان کی عملی مثالیں سامنے نہ ہوں، ان کا حقیقی مفہوم واشگاف نہیں ہوسکتا، ان جزئیات عمل ہی سے اسلام کی مجموعی اور صحیح صورت و شکل سامنے آسکتی ہے۔ اس لئے فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید میں جہاں ایک طرف مجموعۂ دین کے اساسی اصول اور ان کے نیچے ہر ہر باب کے قواعد کلیہ یا ضوابط تفقہ ناگزیر ہیں، وہیں دوسری طرف ان کے نیچے کی عملی جزئیات کا سامنے ہونا بھی لازمی ہے۔ ورنہ اصول کی وسعت و جامعیت کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکتا، اس سے ہی ان حوادث و واقعات پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے جو ان جزئیات کے استخراج کا باعث بنے جبکہ فقہاءِ امت نے قواعد شرعیہ سامنے رکھ کر ان کے بعید سے بعید محتملات کے احکام بھی ان قواعد سے نکالے، ظاہر ہے کہ ہر دور کے حوادث میں نوعی طور پر یکسانی ہوتی ہے، گو حادثوں کی شکلیں حسب زمان و مکان کچھ جدا جدا بھی ہوں۔ اس لئے وہی جزئیات آج کے حوادث میں بھی بیکار ثابت نہیں ہوسکتیں اور کچھ نہیں تو آج کی جزئیات کو کم از کم ان پر قیاس تو ضرور ہی کیا جاسکتا، بلکہ بہت ممکن ہے کہ فقہیات میں ایسی جزئیات بکثرت مل جائیں جو آج کے دور میں سابق دور کی طرح کار آمد ثابت ہوں اور حالات کا پورا مقابلہ کرسکیں۔

ضرورت اگر ہوگی تو باب وار تلاش و جستجو کی ہوگی بلکہ یہ جزئیات چونکہ فقیہانہ ذہنوں سے نکلی ہوئی ہیں اس لئے بہ نسبت ہماری استخراج کردہ جزئیات کے منہاج نبوت سے زیادہ قریب ہونگی۔ اس لئے بجائے اس کے کہ ہم از سرِ نو قواعد کلیہ سے جزئیات کا استنباط کرنے کی مشقت میں پڑیں یہ زیادہ سہل ہوگا کہ استخراج شدہ جزئیات کی تلاش اور ترتیب میں وہ محنت و مشقت استعمال کریں پھر بھی اگر مفتی کو نئے استخراج ہی کی ضرورت داعی ہو تو یہ جزئیات سابقہ ہی اس کا راستہ بہتر طریق پر ہموار کرسکیں گی۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ جب یہ فقہی جزئیات کا ذخیرہ اصول سے جڑا ہوا سامنے آئے تو شاید ہمیں کسی نئے جزئیہ کے استخراج کی ضرورت ہی نہ پیش آئے کیونکہ معلوم ہو چکا ہے کہ فقہاءِ امت نے اصول تفقہ اور قواعد شرعیہ کی روشنی میں بعید سے بعید محتملات تک کے احکام مستنبط کرکے جمع کردیئے ہیں جس کے مجموعہ سے ایک مستقل فن بنام فقہ تیار ہوگیا جس میں ہر شعبۂ زندگی کی بیشمار جزئیات موجود ہیں اس لئے فکر کی تشکیل میں قواعد کلیہ کے ساتھ ان جزئیات کو سامنے رکھنا ازبس ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین نے کسی ایک چھوٹے سے چھوٹے دینی جزیہ کو بھی کسی مرعوبیت یا اقوام کے طعن و استہزا کی وجہ سے کبھی ترک کرنا ناگوارہ نہیں کیا حضرت سلمان فارسیؓ ایک بار بغداد (عراق) میں کھانا تناول فرما رہے تھے۔ ایک فارسی غلام کھانا کھلا رہا تھا کہ ان کے ہاتھ سے لقمہ چھوٹ کر زمین پر گر گیا۔ حضرت سلمانؓ نے اسے فوراً اٹھا کر اسکی گرد جھاڑی صاف کیا

اور تناول فرمالیا۔ غلام نے عرض کیا کہ یہ ملک متمدنوں دولت مندوں اور سیرچشموں کا ہے وہ اس حرکت کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھیں گے۔ فرمایا: اترك سنة حبيبي لهؤلاء الحمقاء ۔ (کیا میں اپنے حبیب پاک کی سنت ان احمقوں کی وجہ سے ترک کر دوں۔؟) غور کیا جائے کہ ایک طرف تو دین کے ایک ایک جزیہ کی پابندی اور دوسری طرف ملکوں کی فتوحات خلافت کی توسیع اور تسخیر اقالیم اور اس کے ساتھ متکبّروں کا تمسخر وطعن، لیکن جو نشہ ان پاک ارواح میں فیضان نبوّت سے پیوست تھا وہ اس قسم کے عوارض سے کبھی ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ آخر صحابہؓ سے زیادہ کون سنن دین کی جزوی جزوی پابندی میں پیش قدم تھا، مگر ان سے زیادہ پھر کون اسلامی فتوحات میں تیز قدم تھا، جس سے ایک طرف تو یہ واضح ہے کہ وقتی احوال و حوادث کے پیش نظر توسع اور ہمہ گیری کے معنی ذہنی ڈھیلے پن کے نہیں کہ قوموں کی رضا جوئی یا مجبوری یا آجکل کی اصلاحی رواداری کے تحت اسلامی جزئیات میں مداہنت کی جاسکے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ اسلام نے اصول اس درجہ وسیع اور لچک دار رکھے ہیں کہ حوادث ان سے باہر نہیں جاسکتے جس کے معنی یہ ہیں کہ دین اپنے خاص مزاج اور اساسی پالیسی کے تحت نہ حوادث میں کبھی تہی دامن ثابت ہوا اور نہ اس نے کہیں اپنے اندر خلا محسوس کر کے سپر ڈالی۔

دوسری یہ بات بھی اس واقعے سے اور اس جیسے ہزاروں واقعات سے نمایاں ہے کہ اسلام روکھی اور سطحی قسم کا کوئی رسمی قانون نہیں بلکہ دین ہے جس کی اساس کا بنیادی عنصر عشق و محبت ہے، جو ذاتِ حق ذاتِ نبوی اور ذواتِ صحابہؓ سے وابستہ ہے اس لئے ایک سچا عاشق اپنے محبوب کی کسی ادا کو ایک آن کیلئے بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جیسا کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے یہاں "حبیبی" کا لفظ استعمال فرما کر اس محبت کیطرف اشارہ فرما دیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ اگر کسی جزیہ کے ترک کرنے میں کوئی قانونی گنجائش بھی نکلتی ہو تو قانون عشق میں ایسی گنجائش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلامی مزاج میں یہ عشقی کیفیات بھی اسی طرح گھلی ہوئی ہیں جیسے پانی میں شکر گھل جاتی ہے، جو ایک راسخ العقیدہ مسلم کو ہر ہر جزیہ کا پابند کئے رہتی ہیں اور اس سے ایک انچ بھی نہیں ٹل سکتا، اس لئے تشکیل نو کے وقت اسلام کی اس خصوصیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن اس انتہائی پابندی اور قید و بند کے ساتھ ہی آزادی، ضمیر اور حریت رائے بھی پوری فراخی کے ساتھ اسلام نے قوم کو بخشی ہے کہ ایک عامی سے عامی آدمی بھی اس قانون حق کے معیار سے مسلمانوں کے بڑے بڑے سربراہ پر روک ٹوک عائد کر سکتا ہے اور اسے عوام کی تنقید کو ماننے سے چارۂ کار نہیں ہوتا، اس کے لئے سب سے بڑی نظیر نماز کی جماعت ہے جس کا نام امامتِ صغریٰ ہے۔ جو کلیۃً امامت کبریٰ یعنی امامت و خلافت پر منطبق ہے۔ وہاں اگر امام اور امیر ہے تو یہاں بھی امام ہے۔ وہاں اگر جہاد میں ہر نقل و حرکت پر نعرۂ تکبیر ہے تو یہاں بھی ہے وہاں اگر امام کے حق میں سمع و طاعت فرض ہے تو یہاں بھی ہے۔ وہاں اگر مجاہدین کی صفیں مرتب اور سیدھی ہونی ضروری ہیں

تو یہاں بھی یہی ہے وہاں اگر میمنہ اور میسرہ ہے تو یہاں بھی ہے۔ وہاں اگر صفوف میں شگاف آجانا ناکامی کی علامت ہے تو یہاں بھی ہے وغیرہ وغیرہ اس لئے امامت صغریٰ (جماعت صلوٰۃ) کے جو طور وطریق رکھے گئے ہیں وہی نوعی طور پر امامت کبریٰ اور اسٹیٹ میں بھی ہیں اس میں صورت حال کے تحت دیکھا جائے تو نماز کے مقتدی اس سے ذرا بھی منحرف ہو تو اسکی نماز ہی صحیح نہیں ہو سکتی، چنانچہ اس مسجد کی امارت اور اسٹیٹ میں مقتدیوں پر فرض ہے کہ جب امام نیت باندھے تو مقتدی بھی ساتھ ساتھ نیت کر کے ہاتھ باندھیں، وہ قیام میں ہو تو یہ بھی قیام کریں، وہ رکوع کرے تو یہ بھی رکوع کریں، وہ قومہ میں جائے تو یہ بھی سربسجود ہو جائیں، وہ ولاالضالین کہے تو یہ آمین کہیں، حتیٰ کہ اگر امام سے سہواً کوئی جزوی غلطی بھی سرزد ہو جائے اور وہ سجدۂ سہو کرے تو مقتدی بھی اسکی اس فکری خطا میں ساتھ دیں اور سجدۂ سہو کریں۔ لیکن حریت وآزادی یہ ہے کہ اگر امام قرأت یا افعال صلوٰۃ میں کوئی ادنیٰ سی بھی غلطی کر جائے تو ہر مقتدی کو نہ صرف ٹوک دینے کا حق ہے بلکہ مقتدی اس وقت تک امام کو چلنے نہیں دے سکتے جب تک وہ اپنی غلطی کی اصلاح نہ کرے یا قرأت صحیح نہ کرے یا کسی رکن میں غلطی ہو جائے اور اسے درست نہ کرے، چنانچہ امام کی غلطی پر ہر ایک مقتدی پیچھے سے تکبیر وتسبیح کی آوازوں سے اس طرح متنبہ کرتا ہے اور کرنے کا حق رکھتا ہے کہ امام غلطی کی اصلاح پر مجبور ہو جائے، بعینہ یہی صورت امامۃ کبریٰ یعنی اسٹیٹ اور ریاست کی بھی ہے کہ امیرالمومنین کی سمع وطاعت تو ہر معاملے میں واجب ہے ورنہ تعزیر وسزا کا مستحق ہوگا، لیکن ساتھ ہی خود امیر کی کسی خطا ولغزش پر ایک عامی سے عامی آدمی بھی بے بلا روک ٹوک کرنے کا حق رکھتا ہے، جب تک کہ امیر اس فعل کی اصلاح نہ کرے یا اس کا کوئی عذر سامنے نہ رکھے،

فاروق اعظم پر ایک اعرابی نے اس وقت اعتراض کیا جب کہ وہ بحیثیت امیرالمومنین ممبر پر کھڑے ہو کر خطبے میں اعلان فرما رہے تھے کہ لوگو! امیر کی بات سنو اور اطاعت کرو۔ اعرابی نے کہا کہ ہم نہ بات سنیں گے نہ اطاعت کریں گے۔ فرمایا کیوں؟ کہا مال غنیمت میں آپ کا حصہ عام لوگوں کی طرح صرف ایک چادر تھی، حالانکہ آپ کے بدن پر اس وقت دو چادریں پڑی ہوئی ہیں فرمایا کہ اس کا جواب میرا بیٹا (عبداللہ ابن عمر) دے گا۔ صاحبزادہ نے فرمایا کہ امیرالمومنین کا قد لانبا تھا ایک چادر کافی نہ تھی اس لئے میں نے اپنی چادر پیش کر دی، وہی ان کے بدن پر ہے جو انہوں نے آج استعمال کی ہے۔ تب اعرابی نے کہا کہ اب ہم بات سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے، بہرحال منہاج نبوت کے مزاج کی رو سے عمل میں تو یہ تقید اور پابندی ہے کہ اس کے کسی کلیہ جزئیہ میں ڈھیلا پن گوارا نہیں کیا گیا حتیٰ کہ ایک عامی آدمی کو بھی امیرالمومنین تک پر کسی محسوس قسم کی فروگذاشت کے بارے میں اعتراض کا حق دیا گیا، لیکن حریت رائے اور اصول کے تحت آزادی بھی انتہائی ہے جو حقیقی قسم کی جمہوریت کی پردہ دار ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اصول و قوانین کی یہ پابندی اور ان میں زندگی کو مقید کر دینا کوئی قید وبند نہیں جو ذہنوں پر شاق ہو، جبکہ ان ہی اصولوں کی

پابندی سے اسلام اور اسلامی قوم عالمگیر بنی۔ آخر جب ہم اسلام کے حق میں ایک عالمگیر دین کے مدعی ہیں تو اس کی ہمہ گیری کے معنی ان کے انہی اصولوں کی ہمہ گیری کے تو ہیں، اگر وہ تنگ اور جامد ہوتے تو اسلام عالمگیر تو کیا عرب گیر بھی نہ ہو سکتا۔ لیکن جب انہی اصول پر صدیوں ہمہ گیر حکومتیں بھی چلیں اور انہی اصول سے ترتیب پا کر قوم میں عظیم عظیم شخصیتیں بھی ابھریں جنہوں نے مشرق و مغرب کو روشنی دکھائی، اور ظلمتوں کی تنگ نائیوں میں پھنسی ہوئی قوموں، نسلوں اور وطنوں کو ان کی مصنوعی حد بندیوں سے نکال کر انسانیت کے وسیع میدانوں میں پہنچایا تو کیا یہ اصول کی تنگیوں سے ممکن تھا اس لئے فطری اصول کی تنگیوں سے ممکن تھا۔ اس لئے فطری اصول اور فطرت کی پابندی کو قید و بند اور تنگی سمجھا جانا ذہنوں کی تنگی کی علامت ہو سکتا ہے۔ فطرت کی تنگی نہیں کہلایا جا سکتا۔ بالخصوص جبکہ ان اصولوں کی وسعتوں میں ایسی گنجائش بھی رکھی گئی ہے کہ ان سے ہر دور کے مفکّر اور اہل علم و فضل نے استخراج مسائل کی حد تک بھی کام لیا ہے۔ اور آج بھی لے سکتے ہیں جن میں ہر دور کے حوادث کے لئے ہدایت کا سامان موجود ہے، اس لئے تمدّن و معاشرت کی مشخص عملی جزئیات اور سنن زائدہ پر اس قانونِ فطرت نے زیادہ زور نہیں دیا بلکہ اس کو وقت اور زمانے کے حوالے کر دیا ہے۔ ہر زمانے میں جو نئی نئی صورتیں بدلتی رہتی ہیں انہیں اہل علم ان کے اصول سے وابستہ کر کے ان کے احکام نکال سکتے ہیں، جیسا کہ مفکران بابِ فتویٰ کا اسوہ اس بارے میں سامنے ہے بالخصوص مسائل کے طرزِ استدلال کے بارے میں تو خاص طور پر ہر قرن جدید کے رنگ جمانا اور دین کے بارے میں محض نقل و روایت لوگوں کے لئے تسلی بخش نہ رہی جب تک وہ عقلی چوسے میں نہ آئے تو رازی و غزالی جیسے حکمائے ملّت نے دین کو فلسفیانہ انداز میں پیش کر کے لوگوں پر حجۃ تمام کی۔ ایک دور میں تصوّف اور حقائق پسندی کا غلبہ ہُوا تو ابن عربی وغیرہ نے صوفیانہ اور عارفانہ انداز سے اسلام کو نمایاں کیا۔ ایک دور معاشی فلسفہ کا زور ہُوا تو شاہ ولی اللہ جیسے حکیم امت نے نظری و معاشی رنگ کے فلسفیانہ دلائل سے اسلام کو سمجھایا، اور وقت کے مسائل حل کئے۔ ایک دور سائینسی اور مشاہداتی فلسفے کا آیا تو بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ جیسے محقق اور عارف باللہ نے اسلامی عقائد و اصول کو مشاہداتی رنگ میں حسی شواہد و نظائر پیش کر کے اتمام حجّت فرما دیا۔ جس سے ایک طرف اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت واضح ہوئی تو دوسری طرف اس کا توسع کھلا اور اس کے رنگِ استدلال کی یہ لچک بھی واضح ہوئی کہ اس کے حقائق پر ہمہ نوع دلائل کا لباس سج جاتا ہے اور حقیقت بدستور حقیقت رہتی ہے۔ جس کے معنے یہ ہیں کہ خود اس میں یہ سارے الوان اور سارے نہج موجود ہیں جس سے ہر رنگ کا لباس زیب زدہ ثابت ہو جاتا ہے جو در حقیقت خود اس کا رنگ ہوتا ہے۔ البتہ حالات اور وقت کے تقاضے صرف اجاگر کر دیتے ہیں، آج کا دور سیاسی اور معاشی اور مختلف نظریات کی سیاستوں اور معاشی فلسفوں کے غلبہ کا ہے مذہب بن رہے ہیں تو سیاسی معاشی پارٹیاں بن رہی ہیں تو سیاسی مسائل پیدا ہو رہے ہیں تو سیاسی اور معاشی ان حالات میں جب تک کسی دینی مسئلے کو سیاسی چاشنی کیساتھ پیش نہ کیا جائے

عوام کے لئے قابلِ التفات نہیں ہوتا اس لئے ضرورت ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے اسلام کو سیاسی اور معاشی رنگ کے دلائل سے پیش کیا جائے یہ سیاسی رنگ اسلام کے حق میں کوئی بیرونی رنگ نہ ہوگا. بلکہ اسی کے اندر کا ہوگا، حالات محرک ہوں گے اور ان کے فطری اور طبعی قسم کے معاشی اور سیاسی بلکہ اس تحریک سے نمایاں ہو کر اسلام ہی کی سیاست و اجتماعیت کے اصول و قوانین نہ ہوتے تو صدیوں تک اسکی وہ مثالی حکومتیں دنیا میں نہ چل سکتیں جنہوں نے دین و دیانت کے غلبے کے ساتھ سیاسی حکمرانی کے فرائض بھی انجام دیئے، اور آج بھی مسلم حکمرانوں کی بود و نمود اسی دور کی مستحکم فرمانروائیوں کے ثمرات ہیں جن میں کتاب و سنت اور فقہ فی الدین کے انوار شامل تھے، البتہ آج کے غالب یا مغلوب مسلمانوں کی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے موجودہ دور کی حکومتوں کے نظریات تو اختیار کر لئے لیکن ان کے عملی کارناموں سے کوئی سبق نہیں لیا، اگر قوم اپنے نظریات قائم رکھ کر آج کے عملی میدانوں میں دوڑتی تو آج بھی وہ ایسی ہی مثالی قوت و شوکت دکھلا سکتی تھی جو اب سے پہلے دکھلا چکی ہے اور دنیا اسی کی تقلید پر مجبور ہوتی، نہ کہ قصہ برعکس ہو جاتا۔ ■

---


موتمر المصنفین کی پہلی پیش کش

دعواتِ حق (جلد اول)

از شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ العالی

خطبات، مواعظ اور ارشادات کا عظیم الشان مجموعہ، علم و حکمت کا گنجینہ جسے ہر لحاظ سے قومی و ملی پریس، سربراہوں اور اہل علم طلبا اور تعلیمیافتہ طبقے نے ہاتھوں ہاتھ لیا دین، شریعت، اخلاق و معاشرت، علم و عمل، عروج و زوال، نبوت و رسالت، شریعت و طریقت کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس پر حضرت شیخ الحدیث مدظلہ نے عام فہم اور دردو سوز میں ڈوبے ہوئے انداز میں گفتگو نہ کی ہے دلوں کو گرمانے والی اور ایمانی و اسلامی انقلاب پیدا کرنے والی ایمان آفریں کتاب، عمدہ کتابت و طباعت، بہترین جلد، صفحات ۶۲۵، قیمت ۳۰/-

★ موتمر المصنفین، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور

---

موتمر المصنفین کی دوسری پیش کش

اسلام اور عصرِ حاضر

از قلم مولانا سمیع الحق مدیر الحق

عصر حاضر کی تمدنی، معاشرتی، معاشی، سائنسی، اخلاقی، آئینی اور تعلیمی مسائل میں اسلام کا موقف، موجودہ دور کے علمی و دینی فتنوں اور فرق باطلہ کا بھرپور تعاقب، نئے دور کے پیدا کردہ شکوک و شبہات کا جواب مدیر الحق کے بے باک قلم سے، مغربی تہذیب و تمدن اور عالم اسلام پر اس کے اثرات کا تحلیل و تجزیہ، الغرض بیسویں صدی کے کارزار حق و باطل میں اسلام کی بالادستی کی ایک ایمان افروز جھلک۔ یہ کتاب آپ کو ایمانی حمیت اور اسلامی غیرت سے سرشار کر دے گی اور سینکڑوں مسائل پر اسلامی نقطہ نظر سے آپ کی رہنمائی کرے گی۔ صفحات ۲۳۰، ستر ابواب، سینکڑوں عنوانات، بہترین کتابت و طباعت، سنہری ڈائی دار جلد، قیمت [illegible]

موتمر المصنفین دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک پشاور پاکستان